تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تقدیر کا عقیدہ

از علامہ ابوالخیر اسدی

مجلسِ نشر السنۃ
مخدوم رشید، ملتان

علامہ ابوالخیر اسدیؒ

ادارہ اسلامیہ
مخدوم رشید۔ ملتان
0331-6444110
idarah.islamia@gmail.com
idarahislamia.com

اسلام کے پردے میں الحاد کی اشاعت

عقائد کی جن بنیادوں پر نجات کا مدار ہے عصر حاضر میں ان کی اس طرح تحریف کر دی گئی ہے کہ شعائر اسلامیہ تو ایک طرف رہے کلمہ شہادۃ کی بنیاد بھی متزلزل ہو گئی انکی تلخیص یہ ہے :-

۱۔ توحید۔ خدا کی صفات کے تکوینی رابطے کو مظاہر آلہیہ کی اصطلاح میں تبدیل کر کے قدسی نفوس کو الوہی اختیار کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ موجودہ دور کی اصنام پرستی یہی ہے۔

۲۔ نبوۃ۔ فلسفہ اصالت کے تحت نبوۃ کے تشریعی مقام کو مصدر کائنات کی اصطلاح میں تبدیل کر کے کائنات کے ظہور و بقا کو حقیقۃ محمدی کا محتاج کر دیا گیا ہے۔

۳۔ ختم نبوۃ۔ آخری نبی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ تا قیامت سارے انسانوں کو ہدایت کے لیے کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہ رہے لیکن ختم نبوت کے مفہوم کو اس طرح تبدیل کر دیا گیا ہے جس سے ہمیشہ کے لیے اجرائے نبوت کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔

۴۔ امامت۔ رفض کی بنیاد نظریہ امامت پر قائم ہے لیکن امامت کے مفہوم کو تکوینی امامت کی اصطلاح میں تبدیل کر دیا گیا ہے تا کہ ساری کائنات پر ائمہ کا اقتدار ثابت ہو سکے۔

۵۔ ولایت۔ ولایت کا مفہوم خدا کی دوستی اور اس کی اطاعت میں محدود تھا لیکن اس دوستی کو تقرب کے حلول میں تبدیل کر کے اولیاء کرام کو تکوینی تصرف کا مالک بنا دیا گیا ہے۔

ہمارے مسلک کا بنیادی مشن یہ ہے کہ امت مسلمہ کو ایسے عجمی نظریات سے بچا کر اسلام کے صحیح راستے سے روشناس کرایا جائے۔ جو نفوس اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے ہیں امید ہے کہ وہ ہماری اس دعوت کو ضرور قبول فرمائیں گے۔ ناچیز ابوالخیر اسدی

مجلس نشر السنۃ مخدوم رشید ملتان

حرفِ اوّل

تقدیر کا مفہوم جو سب سے زیادہ گمراہی کا سبب بنا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے ازلی علم میں جانتا ہے کہ فلاں آدمی پیدا ہو کر تمام زندگی بُرائی کرتا رہے گا۔ اگر وہ پیدا ہو کر اُسی معلوم کے مطابق عمل کرتا رہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سزا کا کیوں مستحق ہوجاتا ہے؟ اِس سے تو ظاہراً بندے پر جبر معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ اِس کے عمل سے ناراض تھا تو پھر اس کے مقدّر میں اِس بُرائی کو پہلے کیوں لکھ دیا گیا تھا۔ اِس سے معلوم ہوا کائنات میں شر کا جس نوعیت سے بھی صدور ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ ایسے عقیدے سے چند مفاسد سامنے آتے ہیں۔ ایک تو ہر معصیت پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ثابت ہوتی ہے جس سے بعثت انبیاء کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ دوسرے آخرت میں سزا و جزا کا جو قانون بنایا گیا ہے وہ ایسے عقیدے کی وجہ سے بالکل معطل ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ جب ہر عاصی اپنی معصیت کے ارتکاب میں

مسلوب الاختیار ثابت ہو رہا ہے تو وہ سزا کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے۔ ائمہ کرام فرماتے ہیں یہ ایسے مفاسد ہیں کہ اگر انہیں بطور عقیدہ تسلیم کر لیا جائے تو آدمی صریحًا کافر ہو جاتا ہے۔

محدث تقی الدین بن دقیق العید کے زمانے میں ایک شخص نے تقدیر کے بارے میں یہ سوال کر کے آپ سے جواب طلب کیا تھا

اذا ما قضٰی ربی بکفری بزعمکم
ولم یرضہ منی فما وجہ حیلتی
اذا شاء ربی الکفر منی مَشیّئۃً
فہا اَنا راضٍ باتباع المشیّئۃ

(طبقات الشافعیہ از امام سُبکی)

ترجمہ (۱) جب آپ کے نظریے کے مطابق میرے رب نے میرے کفر کو ازل میں لکھ دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی قضا کے مطابق میرے اسلام پر راضی ہی نہ تھا اس میں میرا کیا قصور ہے؟

(۲) جب میرے رب کی مشیئت ہی میرے کفر کی متقاضی تھی تو میں بھی اس کی مشیئت کا اتباع کر کے اس کو راضی کرتا رہا ہوں۔

امام سُبکی فرماتے ہیں۔ چوں کہ اس سوال سے ظاہر ہوتا تھا کہ کفر و معصیت کے ارتکاب پر بندہ مجرم نہیں ہے بلکہ اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر عائد ہوتی ہے جو صریح کفر ہے اس لیے محدّث ابن دقیق العید نے فتویٰ دیا تھا کہ اس ملحد کو قتل کر دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ کی تعبیر ایسی دقیق ہے کہ اگر اس کی تفہیم میں تھوڑا سا بھی نقص داخل ہو جائے تو توحید کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ جبر و قدر کی حقیقت کو ذرا سہل کر کے سمجھا دیا جائے تاکہ مشیئت الٰہی کا وہ تعلق جس سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کی خوشنودی کا فرق ظاہر ہوتا ہے اچھی طرح واضح ہو جائے۔

تقدیر پر کفار اور مشرکین کا اعتراض

قرآن مجید میں ہے سب سے پہلے جنھوں نے کفر و معصیت کے جواز میں مشیئت ایزدی کو بطور دلیل اور حجت کے پیش کیا وہ اہل عرب کے مشرکین تھے۔ قرآن میں ان کے شبہات کو متعدد مقامات پر ذکر کر کے اس کے بعد ان کے اشتباہ کی اچھی طرح تردید کر دی گئی ہے جن حقائق

کے ساتھ ان کو جواب دیا گیا ہے۔ اگر آپ بھی انہیں بصیرت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں تو تقدیر پر جو عمومی اشتباہ ہیں ان سے کافی پردے دور ہو جائیں گے۔ کیوں کہ قرآن کے سوا دوسری کون سی اصدق کتاب موجود ہے جو بھٹکی ہوئی انسانیت کی ہر مقام میں صحیح رہنمائی کر سکتی ہو۔ مشرکین عرب کے سامنے جب قرآن کے ذریعے توحید کی دعوت پیش کی گئی تو وہ اپنے کفر کے جواز میں ایک دلیل یہ بھی پیش کرتے تھے جسے وہ اپنے نزدیک عقلاً ایک مضبوط دلیل سمجھتے تھے۔ قرآن میں ہے :-

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اٰباؤنا ولا حرّمنا من شیءٍ کذٰلک کذب الذین من قبلھم حتی ذاقوا بأسنا ط قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ط ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون۔ قل فللہ الحجۃ البالغۃ ج فلو شاء لھدٰکم اجمعین۔

ترجمہ :- مشرکین سے کچھ بعید نہیں کہ یہ حجت پیش کریں کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا ایسا کرتے۔ اور نہ ہم کسی حلال چیز کو (از خود اپنے اوپر حرام کرتے (یہ صرف اُن کی عادت نہیں ہے) بلکہ جو لوگ ان سے

پہلے ہو گزرے ہیں۔ (وہ بھی اس قسم کے دلائل سے) اپنے پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے اِس پاداش میں عذاب کا مزہ چکھا۔ اے پیغمبرؐ! ان لوگوں سے پوچھیے کہ آیا تمہارے پاس اس دلیل کے لیے کوئی کتابی سند موجود ہے۔ اگر ہے تو ہمارے سامنے پیش کرو۔ (ہمیں معلوم ہے کہ سند وغیرہ تمہارے پاس موجود نہیں ہے) بلکہ تم (اپنی اس دلیل میں) محض ظنی خیالات پر چل رہے ہو۔ اور نری اٹکلیں ہی دوڑاتے ہو۔ اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجیے (اس جواب سے) تم پر اللہ کی قوی حجت پوری ہوگئی پس اگر اللہ چاہے تم سب کو (اپنی تکوینی مشیئت سے) صحیح راستے پر چلا دیتے (چوں کہ تمہیں اپنے افعال پر اختیار دیا گیا ہے اس لیے ہدایت پر چلنے کے لیے ہم نے تمہیں مجبور نہیں کیا)"۔

ان کی اس دلیل سے ثابت ہو رہا ہے کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ عین خدا کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہم شرک کی صورت میں جو کچھ کر رہے ہیں یا جن مُردار چیزوں کو جائز سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں، اگر اللہ ہماری ان باتوں پر راضی نہ ہوتا تو ہمیں ایسا کرنے سے روک دیتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو ہماری مشیئت کی آڑ میں اپنے شرک کا

جوازپیش کر رہے ہیں، یہ کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ بلکہ سابقہ مشرکین بھی ایسی ہی خام دلیلوں سے اپنے پیغمبروں کی تکذیب کرتے رہے ہیں۔ یہ تو صرف ان کی تقلید کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ دلیل ان رسولوں کی کتابوں میں بھی موجود ہوتی۔ بلکہ اس کے برعکس معذّب قوموں کے آثار بتلا رہے ہیں کہ اگر ھم ان کے افعالِ شرکیہ پر راضی ہوتے تو انہیں شدید عذابوں کے ساتھ ہلاک کیوں کرتے۔ اگر ان میں ذرا بھی شعور ہے تو ہمارا یہ جواب ایسا ہے کہ اس کا تا ابد بھی جواب نہیں دے سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنے شرک کے جواز میں جس دلیل کے ساتھ ہماری مشیئت کا سہارا لے رہے ہیں یہ ان کی محض فریب کاری ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے اگر ہم مشیئت کے جس جبر سے انہیں شرک پر چلا رہے ہیں اس کے برعکس یہ بھی کر سکتے تھے کہ ھم اپنی قدرت کے ذریعے انہیں شرک سے ہٹا کر سیدھے راستے پر چلا دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ ان دونوں صورتوں میں محض مجبور بن کر رہ جاتے۔ اس سے نہ وہ ہدایت پانے کے بعد قابل تعریف ہوتے اور نہ وہ اس شرک کے بعد قابل ملامت۔ بلکہ وہ انسانیت کے دائرے سے خارج ہو کر جمادات کے برابر ہو جاتے۔ جیسے پانی کسی کو ٹھنڈک

پہنچاتا ہے اس سے نہ اُسے کوئی اجر ملتا ہے نہ اُس کی تعریف کی جاتی ہے۔ اسی طرح آگ جب کسی کو جلا دیتی ہے تو اس آگ کے اس فعل پر اسے کوئی ملامت بھی نہیں کرتا۔ اب قرآن کے ایک دوسرے حکیمانہ جواب کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالٰی کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے چوں کہ ہم بھی اس کائنات کی مخلوق میں داخل ہیں، اس لیے ہمارے وجود سے جس قسم کا بھی کفر اور شرک صادر ہو رہا ہے یہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو مسلمان توحید اور اسلام پر عمل کر رہے ہیں تو وہ بھی اللہ کی مشیئت کے محکوم ہیں۔ ان کا یہ عمل بھی اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے تو پھر کفار و مشرکین مسلمانوں کا مقابلہ کیوں کرتے ہیں اور ان کی توحید کو غلط کیوں کہتے ہیں۔ کیا یہ انصاف ہے کہ اپنے افعال کو تو خدا کی مرضیات میں داخل کر دیں اور اگر وہی خدا اپنی مرضی مسلمانوں پر استعمال کرے تو پھر مشرکین انہیں جھوٹا تصور کریں۔ بلکہ انہیں تو یہ چاہیے تھا کہ دنیا میں مشرکین کے علاوہ جتنے مسلک پائے جاتے ہیں انہیں بھی صحیح تسلیم کرتے اور ان کے ساتھ اپنے اختلاف دور کر دیتے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ مشرکین کا یہ قول کہ ہم کفر و شرک کی صورت میں جو کچھ کر رہے ہیں عین خدا کی مرضی کے مطابق کر رہے ہیں۔ قرآن نے اُن کے اِس نظریے کا اچھی طرح ابطال کر دیا ہے۔ باقی رہا یہ کہ اس مشیئت سے رضا اور عدمِ رضا کے درمیان کیسے امتیاز کیا جائے اِس کو قرآن نے اِس طرح بیان کیا ہے کہ کائنات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دو قسم کے تعلق ہیں۔ ایک تکوینی تعلق دوسرا تشریعی تعلق۔ رضا اور عدمِ رضا کا فرق صرف تشریعی تعلق پر موقوف ہے تکوینی تعلق کے ساتھ اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جیسے ایک گھر میں دو نیک انسان موجود ہیں۔ ایک انسان جوانی کے عالم میں فوت ہو جاتا ہے اور دوسرا ایک طویل عمر کے بعد فوت ہوتا ہے۔ موت کا فعل چونکہ تکوینی تعلق پر موقوف ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ظاہراً جس کو زیادہ عمر دی گئی ہے اُس پر تو اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اور جسے تھوڑی عمر میں فوت کیا گیا اُس پر شاید قدرے ناراضگی ہو۔ بلکہ رضا کے لیے یہ دیکھا جائے گا کہ جو آخر وقت تک نیکی پر جما رہا اُس پر اللہ تعالیٰ زیادہ راضی تھے۔ اور جو نیکیوں میں کچھ کوتاہیاں بھی کرتا رہا ہے اُس پر خدا اتنا راضی ہو گا جتنی اس کی عملی کیفیت سامنے ہو گی۔ اِس سے معلوم ہوا

کہ اللہ تعالےٰ کے جس فعل میں تکوینی مشیئت کا دخل ہو گا اُس پر رضا اور عدم رضا کا امتیاز موقوف نہیں ہے۔ رضا اور عدم رضا کا فرق تشریعی امور میں رکھا گیا ہے۔ مثلاً انبیاءِ کرام کی تعلیم کے ذریعے جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ فلاں فلاں عمل بہت بُرا ہے اُسے مت کرو، اور فلاں فلاں کام بہت اچھا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرتے رہو۔ جب وحی کے ذریعے بتلا دیا گیا کہ فلاں عمل نیک ہے اور فلاں عمل بُرا ہے۔ تو اس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ناراضگی کا فرق بھی ظاہر کر دیا ہے۔ مثلاً زنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک بُرا عمل ہے۔ اس لیے قرآن میں فرمایا گیا ہے لا تقربوا الزنا (زنا کے قریب مت جاؤ) اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں عدل و انصاف نہایت ہی اچھا عمل ہے اس لیے فرمایا ان اللہ یأمر بالعدل اللہ تعالیٰ عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں جن جن باتوں پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان سے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی ظاہر ہوتی ہے۔ اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ایسے اعمال کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ ناراضگی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اقوامِ عالم میں کافی مذاہب پائے جاتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ ان میں سے کون سا دین صحیح

ہے اور کون سا دین باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر قرآن مجید میں فرمادیا ہے ان الدین عنداللہ الاسلام اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو صحیح دین ہے وہ صرف اسلام ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں فرمایا ان اللہ لا یرضیٰ لعبادہ الکفر، جن انسانوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ ان سے قطعاً راضی نہیں۔ دیکھیے لا یرضیٰ کے الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کفریہ اور شرکیہ مذاہب سے راضی نہیں ہے۔ اور جو اُس کے نزدیک پسندیدہ دین ہے وہ صرف اسلام ہے۔ قرآن کی ایسی صریح وضاحت کے بعد بھی اگر کوئی شخص کہے کہ میاں کیا پتہ اللہ کون سے کام پر راضی ہے اور کون سے کام پر ناراض۔ تو ایسے شخص کا یہاں تو علاج نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب خیر سے قبر میں جائیں گے تو وہاں محاسب فرشتے اسے تفصیل کے ساتھ بتادیں گے۔

افعال پر استطاعت کی بحث

آنکھ میں قوتِ بصارت اور کان میں قوتِ سمع کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ اگر آنکھ میں بصارت اور کان میں

قوت سمع کو پیدا نہ کرتا تو انسان نہ کسی چیز کو دیکھ سکتا اور نہ کسی چیز کو سُن سکتا۔ بصارت اور سماعت کی اس نعمت کے بعد انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی آنکھ سے کسی چیز کو دیکھے یا نہ دیکھے اور اپنے کان سے کسی کی بات سُنے یا نہ سُنے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ اگر انہیں اچھے کاموں میں استعمال کرے گا تو اسے اجر ملے گا۔ اور اگر بُرے کاموں میں استعمال کرے گا تو سزا کا مستحق ہوگا۔ اس لیے کہ بصارت کی تخلیق تو اللہ کی طرف منسوب ہوسکتی ہے لیکن بصارت کے عمل میں چوں کہ انسان کو پورا اختیار دیا گیا ہے اگر وہ اُسے بدنگاہی کی صورت میں استعمال کرے گا تو اس بدنگاہی کے فعل کو ہم اللہ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، بلکہ اس ساری ذمہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح سماعت کے عمل کو بھی اسی قاعدے پر محمول کیجیے۔ اب مرکزی بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ جس طرح آنکھ میں قوت بصارت اور کان میں قوت سمع کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے لیکن ان کا استعمال انسان کے اپنے ارادے پر موقوف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سارے بدن میں ایک قوت جامعہ ودیعت کر دی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے

انسان کو پورا اختیار دے رکھا ہے کہ اس قوتِ بدنیہ کو جس
عمل کی صورت میں چاہے، [illegible] کر سکتا ہے۔ اب
اس قوتِ بدنیہ کی تخلیق تو اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب
ہو گی۔ لیکن استعمال کے بعد اس کے جسم سے جس قسم
کے افعال کا صدور ہوتا رہے گا اس کے نتائج کی ساری
ذمہ داری انسان پر عائد ہو گی۔ اس قوتِ بدنیہ کو متکلمین
قوتِ مصحّحہ کہتے ہیں۔ قوتِ مصحّحہ کی مثال ایسی ہے جیسے لوہے کا
وجود ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اس لوہے سے کسی کو قتل کرنے
کے لیے تلوار بنا سکتے ہیں، اور اگر چاہیں تو اس سے استعمال
کرنے کی مفید چیزیں بھی تیار کر سکتے ہیں۔ یعنی لوہا استعمال
کے بعد خیر و شر کی دونوں صورتوں کی تصحیح کر دیتا ہے۔
اسی طرح انسان کے اندر بھی ایک قوتِ مصحّحہ ودیعت کر دی
گئی ہے۔ جسے وہ اپنے اختیار سے خیر یا شر کے جس عمل میں
بھی استعمال کرے گا، وہ قوتِ مصحّحہ اس کے عمل کی تصحیح کرتی
جائے گی۔ عمل کی یہی صورت تصحیح ہے جس کے بعد انسان اللہ کے
نزدیک جزا و سزا کا مستحق بن جاتا ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی فرماتے ہیں:-

إن الاستطاعة التي يعمل بها العبد المعصية هي
بعينها تصلح بعمل الطاعة وهو معاقب في حرف الاستطاعة

التی اودعها اللہ فیہ وامرہ بان یستعملها فی الطاعۃ لا فی المعصیۃ۔

"جس استطاعت کے استعمال سے انسان معصیت کا ارتکاب کر رہا ہے اس استطاعت میں یہ استعداد بھی موجود تھی کہ اس سے عملِ صالح بھی کر سکتا تھا۔ اب انسان کو اس معصیت پر اس لیے سزا دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ استطاعت اس لیے دی گئی تھی کہ وہ اسے طاعت میں خرچ کرتا رہے لیکن اُس نے اپنے اختیار سے اسے اللہ کی نافرمانی میں استعمال کیا۔"

(شرح فقہ اکبر از امام ماتریدی ص۱۰)

اب اِس مفہوم کو قرآن کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

"اے پیغمبرؐ آپ فرما دیجیے! تمہارے رب کی طرف سے حق کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے خواہ تم اپنی مرضی سے مومن بن جاؤ یا اپنی مرضی سے کافر بن جاؤ۔"

(قرآن مجید)

مشیئت آزاد ارادے کو کہتے ہیں جس پر کسی دوسرے کا جبر غالب نہ ہو بلکہ اسے ہر قسم کی آزادی حاصل ہو۔ اس لیے اس آیت میں فرمایا گیا فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر یعنی کفر و ایمان کے وجود میں جس قدر اس کے لوازمات پائے جاتے ہیں، انسان کے اندر استطاعت کا ایسا جوہر ودیعت کیا گیا ہے کہ وہ اگر چاہے تو اپنی مرضی سے فرعون سے بھی بڑھ کر کافر بن سکتا ہے۔ اور اگر چاہے تو حضرت آسیہؓ جیسا مقام بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان جب اپنی قوتِ ارادیہ سے کسی فعل کا عزم کر لیتا ہے اگر وہ فعل خیر کی صورت میں ہوتا ہے تو قوتِ مصحّحہ اس خیر کے تمام لوازمات مہیا کرتی جاتی ہے اگر وہ فعل معصیت کی صورت میں ہوتا ہے تو معصیت کے جتنے اسباب ہوتے ہیں، وہ اسباب خود بخود آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ قوتِ مصحّحہ ان کے اندر ایک مادے کی صورت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد انسان کی قوتِ ارادیہ کو پورا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس مادے سے خیر و شر کا ہر عمل آسانی کے ساتھ ڈھال سکتا ہے۔ جیسے انگور کے ثمر میں انسانی صحت کے لیے غذائی اثر بھی موجود ہے اور اس کے دوسرے استعمال سے شراب بھی

تیار ہو سکتی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جب شر کے وجود سے انسان کو اتنا نقصان پہنچ رہا ہے تو پھر اسے پیدا کیوں کیا گیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ اگر آپ اپنے ہاتھ سے پتھر اٹھا کر کسی کو زخمی کر دیں۔ چوں کہ اس شر کا صدور آپ کے ہاتھ سے ہوا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی فیصلہ کرے کہ چوں کہ شر کا صدور آدمی کے ہاتھ سے ہوا ہے۔ لہٰذا ایسے ہاتھ کو بالکل معدوم کر دیا جائے تاکہ آئندہ شر کا صدور ممکن نہ رہے۔ بتلائیے ایسا فیصلہ آپ کے نزدیک صحیح ہے یا غلط۔ کیا آپ کے ہاتھ کو معدوم کر دیا جائے یا آپ سے اتنا کہہ دیا جائے کہ آپ اپنے ہاتھ کو اس عمل کے لیے آئندہ استعمال نہ کریں۔ کیوں کہ آپ کو اختیار دیا گیا ہے کہ جس طرح آپ اپنے ہاتھ سے کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اسی ہاتھ سے آپ دوسرے انسانوں کو نفع بھی پہنچا سکتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پتھر یا تلوار بنفسہٖ کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتی بلکہ انسان کا غلط عمل تلوار اور پتھر کے وجود کو شر کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ دوسرا جواب

یہ ہے کہ ہر صفت اپنے تضاد کے عمل سے پہچانی جاتی ہے بخل کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ آدمی کس طرح اس کی مدافعت کر کے اپنے اندر سخاوت کی خو پیدا کر سکتا ہے اور کس طرح اپنے غصے کو دبا کر دوسرے کے ساتھ عفو اور رحم دلی کا اظہار کر سکتا ہے۔ غصہ ہر جگہ مذموم نہیں ہوتا۔ بلکہ جب کوئی ظالم کسی پر حملہ کرتا ہے تو یہی غصے کی قوت غضبیہ اس کا مقابلہ کر کے اس کے مال اور عزت کو محفوظ کر لیتی ہے۔ اس کے بعد اُس آدمی کی تعریف کی جاتی ہے کہ دیکھیے فلاں کتنا غیور اور باہمت انسان ہے کہ حملے کے وقت اس نے ایسے بدمعاش کے پرخچے اڑا دیے۔ اگر آپ اس وقت میاؤں میاؤں کرتے تو مال بھی لٹوا بیٹھتے اور ساتھ ہی بے غیرتی کے ساتھ مشہور بھی ہو جاتے۔ اسی طرح کذب ایک قبیح صفت ہے۔ لیکن شریعت نے اجازت دے رکھی ہے کہ جہاں دو اُلجھے ہوئے فریقین میں باہم مصالحت کرانی ہو تو وہاں مجبوری کے تحت کذب بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ دیکھیے یہاں کذب کو مصالحت نے خیر کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔

انسان کا فعل اور علمِ الٰہی

مفسرِ قرآن مولانا عبدالحق حقانی لکھتے ہیں:۔

سوال:۔ جب یہ ثابت ہوا کہ ہر ایک کام بندہ کا اللہ کے ارادہ سے ہوتا ہے اور ازل میں اُس کو اس کی خبر تھی۔ پس دو حال سے خالی نہیں، یا تو کسی کام کے نہ کرنے کا اللہ ارادہ کرے گا اور ازل میں اُس کو معلوم ہوگا کہ یہ کام اِس سے نہیں ہوگا۔ اور یا اس کے کرنے کا ارادہ اور علم ازلی ہوگا۔ پہلی صورت میں وہ کام ہونا ممتنع ہوجائیگا اور دوسرے میں اس کا ہونا ضرور ہوگا۔ ورنہ ارادہ اور علمِ الٰہی تخلف لازم آئے گا۔ اور جب ایک کام ہونا ضروری یا ممتنع ہوا تو بندے کا اختیار کہاں رہا۔ پس جو ممتنع ہے وہ اُس سے کبھی نہ ہوگا اور جو ضروری ہے وہ اس سے خواہ مخواہ سرزد ہوگا۔

جواب:۔ اللہ تعالیٰ ازل میں یوں جانتا تھا کہ اس کام کو بندہ اپنے اختیار سے کرے گا، اور اس کام کو اپنے اختیار سے چھوڑ دے گا۔ اور اسی طرح ارادہ کیا کرتا ہے کہ بندہ اپنے اختیار سے اس کام کو کرے گا اور اس کام کو اپنے اختیار

سے نہ کرے گا۔ بہرحال اختیار بندہ کو مل گیا۔ جس طرح کوئی بادشاہ کسی غلام سے کوئی کام کرانے کا ارادہ کرے تو اس صورت میں اگرچہ غلام اس کے ارادہ کے بموجب اس کو کرے گا لیکن نفسِ اختیار اس کا زائل نہ ہوگا اور وہ کام اُس غلام سے اس طرح بے اختیار سرزد نہ ہوگا کہ جس طرح رعشہ والے کا ہاتھ از خود ہلتا رہتا ہے۔ اور ازل میں اس بات کو جاننے سے کہ بندہ اس کام کو بالاختیار کرے گا یا نہ کرے گا، بندہ کا اختیار نہیں جاتا۔ اُس کا علم اُس کے اختیار کو زائل نہیں کرتا۔ اور جواب الزامی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جمیع افعال بالاتفاق اختیاری ہیں۔ حالانکہ وہ ازل میں جانتا تھا کہ فلاں شخص کو فلاں وقت غنی کروں گا اور فلاں کو فقیر۔ پھر جس طرح اُس کے علمِ ازلی سے اس کا اپنا اختیار نہیں جاتا رہا اسی طرح بندے کا اختیار بھی دور نہیں ہوتا۔

عقائد الاسلام۔ ص ۱۴۵

علمِ الٰہی کے ساتھ بندوں کے افعال کی تطبیق

تقدیر کے بارے میں سب سے بڑا مشکل سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے علمِ قدیم میں یہ جانتا تھا کہ ابوجہل ساری عمر کفر کرتا رہے گا تو پھر ابوجہل کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ ایمان نہ لائے۔ ورنہ علمِ الٰہی کے خلاف ہو جائے گا۔ جب وہ اپنے مقدر کے مطابق کفر کرنے میں مجبور ہے تو پھر وہ سزا کا کیسے مستحق ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم میں یہ جانتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک قوت ودیعت کر دی گئی ہے اِس قوت میں ایسی صلاحیت موجود ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس قوت کے ذریعے کفر بھی کر سکتا ہے۔ اگر چاہے تو اس قوت کو صحیح استعمال کر کے مومن بھی بن سکتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں علمِ الٰہی میں داخل ہیں۔ یہ نہیں کہ اگر انسان اپنی مرضی سے

ساری عمر کفر کرتا رہے۔ اُس کا یہ کفر تو علم الٰہی میں سمجھا جائے اس کے بعد اگر وہ ایمان لاتا تو کیا یہ ایمان لانا علمِ الٰہی کے خلاف ہو جاتا۔ بلکہ اُس کا یہ ایمان بھی علمِ الٰہی میں داخل ہونا سمجھا جائے گا۔ اس لیے انسان اِن دونوں صورتوں میں جس صورت کو بھی اختیار کرے اللہ کا علم اس کے اختیار کو سلب نہیں کرتا۔ اگر علم الٰہی انسانی اختیار کو سلب کرتا تو یہ علمِ الٰہی اُس کے اپنے اختیار کو بھی سلب کر لیتا۔ مثلاً اللہ کے علم میں ہے کہ زید ساری عمر میں اپنے اختیار سے ایمان نہ لائے گا۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے اگر اپنے اختیار سے اسے مومن بنا دے تو جس علم میں پہلے زید کا کفر مقدر ہو چکا تھا تو کیا یہ علم اللہ کے اپنے اختیار کو سلب کر سکتا ہے۔ پس جس طرح اللہ کا علم اپنے اختیارات کو سلب نہیں کر سکتا اسی طرح انسان کے ذاتی اختیار کو بھی اللہ کا علم سلب نہیں کرتا حضرت تھانوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"جس طرح کوئی واقعہ علم الٰہی کے تعلق سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی واقعہ ارادۂ الٰہیہ کے تعلق سے بھی خالی نہیں ہے۔ اگر علمِ الٰہی سے نفی اختیار کی لازم آجائے تو ظاہر ہے کہ ارادۂ الٰہیہ خود افعالِ الٰہیہ کے متعلق ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا اپنا اختیار بھی ان افعال پر باقی

نہ رہے۔ حالانکہ اس کا کوئی عاقل بھی قائل نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ ارادہ کا تعلق افعالِ عباد کے وقوع کے ساتھ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک قید کے ساتھ ہے یعنی وقوع باختیارہم۔ پس تعلق ارادہ اس کے متعلق کے وجوب کو مستلزم ہے اِس سے تو انسانوں کے اختیار کا وجود اور مؤکد ہوگیا نہ کہ اس سے اختیار کی نفی ثابت ہو رہی ہے۔"

(انتباہات المفیدؔ ص۳۸)

امام ابوالشکور السالمی جو علم کلام کے ایک مسلّم امام ہیں، اُن سے ایک مجوسی نے سوال کیا تھا:۔

" ایک کافر جب کفر کی حالت میں مرجاتا ہے تو کیا اللہ تعالٰے جانتا تھا کہ یہ آدمی کفر کی حالت میں مرے گا۔"

آپ نے فرمایا:۔

" ہاں "

اس کے بعد وہ مجوسی سوال کرتا ہے:۔

"جب اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ آدمی کفر پر مرے گا تو کیا یہ کافر اختیار رکھتا تھا کہ وہ اس حالت میں ایمان لائے یا نہ لائے۔ اگر آپ کہیں کہ وہ ایمان لانے پر قادر تھا، تو اس سے علمِ الٰہی کے خلاف ثابت ہوجائیگا

حالانکہ یہ بات محال ہے۔ اگر آپ کہیں کہ وہ ایمان لانے پر قادر نہ تھا تو پھر اس سے جبر ثابت ہوجائے گا۔"

آپ نے فرمایا :۔

"بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ آدمی کفر پر مریگا لیکن اللہ کا یہ علم اس بندہ کے ذاتی اختیار کو سلب کر سکتا۔ کیوں کہ جس طرح اِسے کفر لانے کا ذاتی اختیار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنے اختیار سے ایمان لاتا تو یہ قدرت بھی اس کے اندر موجود تھی لیکن اس نے جان بُوجھ کر اس طاقت کو استعمال نہ کیا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ جس طرح یہ جانتا ہے کہ انسان ساری عمر کفر کرتا رہے گا، اسی طرح یہ بھی جانتا ہے کہ یہ کفر اپنے اختیار سے کر رہا ہے۔ ورنہ اس میں یہ صلاحیت بھی موجود تھی کہ وہ ایمان بھی لا سکتا تھا۔ چوں کہ یہ دونوں صورتیں علمِ الٰہی میں موجود تھیں اس لیے اس کا ایمان نہ لانا نہ تو علمِ الٰہی کے خلاف ہے اور نہ علمِ الٰہی اسے کفر کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جزا و سزا انسان کے اپنے اختیاری عمل پر

موقوف ہے۔ علمِ الٰہی سے انسان کا ذاتی اختیار زائل نہیں ہو سکتا۔

اِسی طرح آپ سے دوسرا سوال کیا گیا:۔

"کیا اللہ تعالیٰ اپنے برابر کوئی دوسرا خدا بھی جانتا ہے؟ اگر آپ کہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مثل دوسرا خدا نہیں جانتا تو اس سے اللہ تعالیٰ پر جہل لازم آئے گا۔ اگر آپ کہیں کہ وہ جانتا ہے تو اس سے آپ دوسرا خدا ثابت کریں گے۔

آپ نے فرمایا:۔

"بے شک اللہ تعالیٰ اپنے علم میں جانتا ہے کہ نہ کوئی اس کے مثل ہے اور نہ کوئی اس کا دوسرا شریک ہے۔ جس طرح مثبت وجود کو مثبت کی صورت میں جاننا علم ہے اسی طرح ممتنع الوجود کو نفی کی صورت میں جاننا بھی علم ہے۔

ابو الشکور السالمی مزید لکھتے ہیں:۔

جس وقت ابلیس پر لعنت کی گئی تو ابلیس کہنے لگا اے اللہ جب تو نے میرے مقدر میں لکھ دیا تھا کہ میں سجدہ نہ کروں گا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ اس پر مجھے سزا دی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بات تجھے کس وقت معلوم

ہوئی۔ سجدہ نہ کرنے سے پہلے یا اس کے بعد۔ ابلیس نے
کہا کہ سجدہ نہ کرنے کے بعد۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس
یہی حجت ہے کہ جس کی وجہ سے تو ملعون قرار دیا گیا ہے۔
اگر میرے لکھنے بعد میری مرضی یہی تھی کہ تو سجدہ نہ کرے
تو پھر میں نے تجھے سجدہ کرنے کا حکم کیوں دیا تھا۔ میرے اس
حکم سے ظاہر ہو رہا ہے کہ میں سجدہ کرنے میں راضی تھا اور
نہ کرنے میں ناراض۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کا تعلق معلوم
کے وقوع کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ نہ ذات علیم کے اپنے
اختیار کو سلب کرتا ہے اور نہ اپنے معلوم کے ذاتی اختیار پر
جبر کرتا ہے۔"

(تمہید ابو الشکور السالمی)

تقدیر کی غلط تعبیر کا ضرر

علامہ اقبال فرماتے ہیں :۔

میرے دوست منشی محمد دین فوق ایڈیٹر رسالہ
طریقت نے مجھ سے سوال کیا کہ تم نے حافظ شیرازی پر
کیوں اعتراض کیا ہے۔ میں نے انہیں ایک واقعہ کی طرف

توجہ دلائی، وہ یہ ہے :-

" اورنگ زیب عالمگیر نے جو بڑا متشرع بادشاہ تھا، ایک مرتبہ اس نے حکم دیا کہ اتنے عرصہ کے اندر جتنی طوائفیں ہیں نکاح کر لیں۔ ورنہ میں کشتی میں بھر کر سب کو دریا بُرد کر دوں گا۔ سیکڑوں نکاح ہو گئے۔ مگر پھر بھی ایک بڑی تعداد رہ گئی۔ چنانچہ اُن کے ڈبونے کے لیے کشتیاں تیار ہوئیں۔ صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ یہ زمانہ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا تھا۔ ایک حسین طوائف روزمرہ آپ کے سلام کو آیا کرتی۔ جب آپ وظائف سے فارغ ہوتے وہ سامنے آکر دست بستہ کھڑی ہو جاتی۔ جب آپ نظر اٹھاتے وہ سلام کر کے چلی جاتی۔ آج جو وہ آئی تو بعد سلام عرض کرنے لگی کہ آج خادمہ کا آخری سلام بھی قبول ہو۔ آپ نے حقیقتِ حال دریافت فرمائی۔ جب تمام کیفیت بیان کر دی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ شیرازی کا یہ شعر ؎

در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را

ترجمہ :- اے خدا تو نے خود ہی ہمیں نیکی کے دروازے پر جانے کی توفیق ہی نہ بخشی۔ اگر تو ہمارے گناہوں کو پسند نہیں کرتا تو پھر اپنے تقدیر کے فیصلے کو ہی بدل ڈال۔ اس شعر کو تم سب

یاد کر لو۔ اور کل جب تمہیں دریا کی طرف لے چلیں تو بآواز بلند اس شعر کو پڑھتے جاؤ۔ اُن سب طوائفوں نے اس شعر کو یاد کر لیا۔ جب روانہ ہوئیں تو یاس کی حالت میں نہایت خوش الحانی سے بڑے درد انگیز لہجے میں اس شعر کو پڑھنا شروع کیا۔ جس جس نے یہ شعر سُنا دل تھام کے رہ گیا۔ جب بادشاہ کے کان میں آواز پہنچی تو بے قرار ہو گیا ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی، حکم دیا کہ ان سب کو چھوڑ دو۔

علّامہ اقبال اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں :۔

"مسئلہ تقدیر کی ایک ایسی غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ شیرازی کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور باعمل بادشاہ کو جو آئینِ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور طوائفوں کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو اس بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا، قلبی اعتبار سے اس شعر نے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانینِ اسلامیہ کی تعمیل کرانے کی ہمت نہ رہی۔"

(تاریخ تصوف از علّامہ اقبال ص۱۵۱)

حافظ شیرازی پر تنقید کی وجہ

حافظ شیرازی نے ایک جگہ لکھا ہے :-

پیالہ بر کفنم بند تا سحر گہ حشر
بہ مے ز دل بِبَرم ہول روزِ رستاخیز

ترجمہ۔ یعنی میرے کفن میں شراب سے بھرا ہوا پیالہ رکھ دینا تاکہ حشر کے روز ہنگامہ رستاخیز کے باعث دلوں پر جو خوف و دہشت طاری ہوگی اُسے دور کرنے کے لیے اس شراب سے مدد لوں گا۔

اسی شعر کے مضمون سے ناراض ہوکر علامہ اقبال نے اسرارِ خودی میں یوں تنقید کی ہے :-

رہنِ ساقی خرقۂ پرہیزِ او
مے علاجِ ہولِ رستاخیزِ او

ترجمہ :- اُس کے زہد و ورع کا خرقہ ساقی کے پاس رہن رکھا ہوا تھا، اور وہ شراب کا اتنا رسیا تھا کہ حشر کے خوف کو بھی شراب کے نشے سے دور کرنا چاہتا تھا۔

(حافظ شیرازی اور اقبال۔ ص ۳۱۳)

حافظ شیرازی کے اس شعر کے جواب میں ہم بھی ان کی خدمت

عالیہ میں ادبا گزارش کرتے ہیں :-

این قدر مے نوش در یوم عظیم
تا شوی محظوظ در نار جحیم

اسدی

ابلیسی گُر

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوا جب ایک انگریز میجر کی بیوہ بانیٔ دیندار انجمن حضرت مولینا صدیق دیندار چن بسویشور قدس اللہ سرہ العزیز کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئی تھی۔ اس کے آں جہانی شوہر کے کتب خانہ سے ایک کتاب (Military Mentor) (خفیہ فوجی ہدایات) بانیٔ انجمن کے ہاتھ آئی تھی۔ اس میں ایک نئے مفتوحہ عرب علاقہ کا جذبہ حُرّیت ختم کر کے انہیں "مرد" سے "نامرد" بنانے کا یہ "ابلیسی گر" لکھا ہوا تھا۔

Order them to lay aside their arms. Let them drink and debauch. Let them sing and play upon harps. Let them wear long waists and buskins, so as to envy one another. You will see in a few days. they shall be turned from men to women.

(Military Mentor)

ترجمہ: "انہیں غیر مسلح کر کے، عیاش اور زناکار بنا کر ناچ رنگ اور ساز و آہنگ میں لگادو، اور فیشن کو ایسا فروغ دو کہ فیشن پرستی میں یہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کیلئے باہم رقابت و حسد کرنے لگیں، تم دیکھو گے کہ چند ہی دن میں یہ "مرد" سے "نامرد" ہوجائینگے"۔

اس "نسخۂ ابلیسی" کو بار بار پڑھئے اور انگریز کے عروج اور مسلمان کے زوال کی تاریخ دہراتے جائیے یہی "ابلیسی گر" ہر جگہ کار فرما نظر آئے گا۔
لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب فرمایا تھا۔

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں

مغربی رنگِ طبیعت کو بدل دیتے ہیں